Tarseel, Vol.18 (ISSN: 0975-6655

A Peer Reviewed Research Journal of Urdu

Listed in UGC-CARE

Directorate of Distance education,

University of Kashmir

منور رانا کے منظوم و منثور کلام کا فکری و فنی جائزہ

ڈاکٹر جاں نثار عالم

تلخیص

منور رانا کی شخصیت اپنی مثال آپ ہے۔انہوں نے جس ہنرمندی سے روایتی موضوعات کو نئے اسلوب کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا وہ انہی کا خاصہ ہے۔آپ اردو شعر و ادب میں اپنے منفرد لب و لہجے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔اردو غزل جیسی ہر دلعزیز صنف سخن میں رنگارنگ موضوعات کو پیش کرنے کے دوش بہ دوش اردو نثر میں انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہے اور سنجیدگی و فکری گیرائی و گہرائی بھی۔الغرض منور رانا عہد حاضر کے ایک ممتاز و معروف شاعر ہی نہیں بلکہ عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔اس تحقیقی مضمون میں منور رانا کی شاعری اور نثر نگاری کا فکری و فنی جائزہ پیش کرنے کی سعی جائے گی جو ایک اضافے کا موجب ہوگا۔

کلیدی الفاظ:

سیاسی ندنظمی، روحانی اقدار، تقسیم ملک، ہجرت، فسادات، اسلوب، طنز و مزاح

عالمی شہرت یافتہ جدید دور کے منفرد و بہترین شاعر منور رانا جن کی شناخت مٹی سے وفاداری، ماں کی محبت، سیاسی بد

نظمیوں اور معاشرتی بدحالیوں کو شاعری میں پرونے والے بے باک اور احتجاجی شاعر کی ہے۔اردو دنیا کی اس مایہ ناز شخصیت نے ۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو رائے بریلی کے ایک معزز خاندان میں آنکھ کھولی جہاں گاؤں کی سچی اور سیدھی سادی زندگی تھی، جہاں کا مذہب انسانیت کا مذہب تھا لوگ انسانیت کے رشتے سے بندھے تھے۔اسی رائے بریلی میں انہوں نے ابتدائی تعلیم شعیب وداليہ اوور گورنمنٹ انٹر کالج رائے بریلی سے حاصل کی۔منور رانا ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد انور علی کلکتہ میں ٹرک ڈرائیور تھے جو نہایت ہی نیک دل، ملنسار، سادہ مزاج اور خوددار انسان تھے۔اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود ادب سے ان کو گہرا شغف تھا اور کئی شعراء کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔زندگی کے نامساعد حالات کے باوجود بھی انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔۱۹۶۵ء میں انہوں نے منور رانا کو اپنے پاس کلکتہ بلا لیا لیکن ہند و پاک کی جنگ کا اعلان ہو جانے کے سبب انہیں اپنے بھائیوں کے ساتھ لکھنؤ بھیج دیا گیا اور پھر یہاں کے تہذیبی اور ادبی ماحول میں ہی منور رانا نے اپنی زبان و بیان کو تراشا اور نکھارا۔چنانچہ لکھنؤ میں تین سال گزارنے کے بعد وہ دوبارہ کلکتہ چلے گئے اور یہاں انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا اور محمد جان ہائیر سیکنڈری سے انٹر کر کے گریجویشن کے لیے کلکتہ کے ہی امیش چندرا کالج میں بی۔کام میں داخلہ لیا۔منور رانا کی زندگی پریشانیوں اور مفلسی میں گزری جس کی تمازت نے انہیں کھرا کندن بنا دیا۔منور رانا نہایت ہی نڈر، حاضر جواب، ملنسار اور خوش مزاج انسان تھے اور ان کی ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی حالات زندگی کو بھی بیان کرنے میں دیانت داری کا دامن پکڑے رکھا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے کیا پتہ زمیندار کیسے ہوتے ہیں، کیونکہ میں نے مدتوں اپنے ابو کے کے ہاتھوں میں ٹرک کا اسٹیئرنگ دیکھا ہے۔میں نے بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ممکن ہے میرے ابو نے بھی خواب دیکھے ہوں کیونکہ ایک تھکا ماندا ٹرک ڈرائیور بہت بے خبری کی نیند سوتا ہے۔لیکن مجھے معلوم ہے میری ماں نے کبھی خواب نہیں دیکھا تھا کیونکہ خواب تو وہ آنکھیں دیکھتی ہیں جو سوتی ہیں لیکن میں نے اپنی امی کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ان کی آنکھیں ہمیشہ گھر کی دہلیز اور جسم جانماز پر رکھا دیکھا ہے اور جوانی اس ٹرک ڈرائیور کے انتظار میں قطرہ قطرہ پگھلتے دیکھی ہے جو میرے ابو بھی تھے اور امی کے سر کا آنچل بھی۔''[۱]

منوررانا کی ادبی زندگی آغاز بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے ہوا جس کو پروان چڑھانے میں ان کے دادا مرحوم سید صادق علی اور لکھنؤ کے ادبی ماحول نے اہم رول ادا کیا۔ منوررانا کے دادا ان سے دیگر شعراء کی غزلیں باقاعدہ پڑھوایا کرتے تھے جس سے ان کی دلچسپی شعروشاعری کی طرف مائل ہوگئی اور شعروشاعری سے اسی انسیت نے سولہ سال کی عمر میں منوررانا سے شعر کہلوائے لیکن ابتداء میں باقاعدہ طور پر منور علی آتش کے نام سے کلکتہ کے ماہنامہ ''شہود'' میں مسلسل اپنی تحریر شائع کرانے لگے بعد میں وہ لکھنؤ آئے اور والی آسی کے شاگرد ہوگئے۔ اپنے استاد کے مشورے پر رانا تخلص اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ منوررانا کی علمی وادبی زندگی پر والی آسی کا اہم اثر رہا ہے جس کے متعلق منوررانا کہتے ہیں:

> ''میں نے ان سے اپنا شاگرد بنانے کی کی گزارش کی تو انہوں نے انکار کردیا انہوں نے کہا کہ، استاد شاگرد کا رشتہ نبھانا بہت مشکل ہے، نہ آپ شاگردی کا حق ادا کرپائیں گے نہ میں استادی کا، آپ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہے جو مجھے آتا ہوگا میں بتادوں گا۔ جب میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ کوئی استادی کا گر بھی بتادیجیے تو انہوں نے ہنستے ہوئے ایک ایسی بات کہی جو میں چہارسو کے ذریعے نئے لکھنے والوں سے (share) کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ کسی سے برا کام کرالینا لیکن کبھی مصرعہ مت لینا۔''[۲]

منور رانا کے متعدد شعری مجموعے ''غزل گاؤں ''(۱۹۸۰ء)،''پیپل چھاؤں ''(۱۹۸۵ء)،''مور پاؤں ''(۱۹۸۹ء)،''نیم کے پھول''(۱۹۹۳ء)،''سب اس کے لیے''(۱۹۹۵ء)،''بدن سرائے''(۱۹۹۸ء)،''کہو ظل الٰہی سے''(۲۰۰۱ء)،''منوررانا کی سوغزلیں''(۲۰۰۵ء)،''جنگلی پھول''(۲۰۰۸ء)،''شہدابہ''(۲۰۱۲ء) وغیرہ منصفہ شہود پر آچکے ہیں۔ عہدِ شباب میں منوررانا کا رجحان اسٹیج ڈراموں میں بھی تھا اور انہوں نے کچھ فلمی ستاروں کی آواز کی نقالی سے اس کی ابتداء بھی کی تھی پھر ۱۹۷۱ء میں کلکتہ ایک ہومیوپیتھی کالج میں منعقدہ سہ لسانی ڈرامہ مقابلے کے لیے پہلا ڈرامہ ''جئے بنگلہ دیش'' تحریر کیا اور اس کی ہدایت بھی کی جس پر انہیں انعام ملا اور وہ یہیں نہیں رُکے بلکہ انہوں نے پرتھوی راج اور آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ آنکھ کا نشہ میں اداکاری بھی کی جس کی بہت پذیرائی ہوئی۔

منوررانا نے دنیا کے تمام رشتوں سے پاکیزہ ومقدس رشتے ''ماں'' کو غزل کے روایتی عاشق معشوق کے مضامین کی جگہ

ماں کو مرکزی حیثیت دی اور ماں کے عنوان سے ہی ایک پوری کتاب لکھ ڈالی حالانکہ اردو شاعری میں ماں پر لکھنے والے اور بھی کئی شاعر ہیں ۔فراق گورکھپوری، پروین شاکر، عباس تابس اور ندا فاضلی جیسے قابلِ قدر شعراء کے یہاں بھی ماں کی اس عظمت کا احساس ملتا ہے۔ یہاں تک کہ عظیم شاعر علامہ اقبال نے بھی ماں کے خواب پر ایک نظم لکھی ہے لیکن منور رانا نے ماں کے رشتے کو مختلف جہتوں اور پہلوؤں سے پیش کیا ہے کہ یہ ان شناخت بن گیا ہے ۔منور رانا کے متعلق وہاب اشرفی اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> کہہ سکتے ہیں کی منور رانا کی شاعری کا یہ رُخ کربناک ہے جس کے امتیازات کو میرے علاوہ بہتوں نے محسوس کیا ہے اور ادھر دوسروں نے ابھی اپنی ماؤں کی وفات کے بعد کچھ شعر کہے ہیں ۔جن میں کرب کا پہلو ابھرتا ہے۔اس سلسلے میں پروین شاکر یاد آرہی ہیں ۔اس سلسلے میں ان کا ایک مجموعہ ''نہال دل پر سحاب'' جیسے اشاعت سے گزر رہا ہے لیکن میں کہوں گا کہ منور رانا اپنے والدین کی توقیر میں جیسے اشعار کہہ رہے ہیں ان کی انفرادیت مسلّم ہے اور اردو شعر وادب میں ان کی ایک واضح جگہ ہے۔ میں منوّر رانا کو ایک غنائی (Lyrical) شاعر سمجھتا ہوں جن کے یہاں شعری روایات کا پاس بھی ہے اور نبھانے کی سعی بھی۔ایسے وہ کانٹوں پر چلنے والے شاعر ہیں جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ان کانٹوں کو پیروں سے نکالنے میں گزرا ہے۔''[۳]

وہ ماں کے مقدس جذبات اور بے لوث محبت کو جتنی سچائی، شدت، اور سادگی سے بیان کرتے ہیں یہ انہیں کا خاصہ ہے۔ جیسے

ابھی زندہ ہے ماں میری مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا
میں گھر سے جب نکلتا ہوں دعا بھی ساتھ چلتی ہے
منور ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رونا
جہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی
چلتی پھرتی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنّت تو نہیں ہے ماں دیکھی ہے
سر پھرے لوگ ہمیں دشمن جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹّی کو بھی ماں کہتے ہیں
ترے دامن میں ستارے ہیں تو ہونگے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

آپ کی شاعری میں ماں کی شخصیت پورے تقدس کے ساتھ تو نظر آتی ہی ہے ساتھ ہی ماں سے منسوب اشعار میں بھی آپ نے قدرے احترام، پاکیزگی اور معصومیت کے ساتھ اس کی جلوہ گری کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

میری خواہش ہے کہ میں پھر سے فرشتہ ہوجاؤں
ماں سے اس طرح لپٹ جاؤں کہ بچہ ہو جاؤں
کبھی بھی مجھے یوں اذاں بلاتی ہے
شریر بچے کو جس طرح ماں بلاتی
اے اندھیرے دیکھ لے منھ ترا کالا ہوگیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں گھر میں اجالا ہوگیا

منور رانا گھریلو اور مقدس رشتوں کے پاسدار شاعر ہیں۔ نہ صرف ماں کے پاکیزہ رشتے کو خوبصورتی سے اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے بلکہ بیٹی اور بہن کی شفقت، بھائی کی محبت، بے لوث اور بے غرض رشتوں کے معصوم جذبات سے اپنی غزلوں کی زینت کو بڑھایا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں ماں ہے وہیں بیٹی، بھائی اور بہن بھی ہیں۔ ان رشتوں سے منسوب چند

اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ چڑیا بھی میری بیٹی سے کتنی ملتی جلتی ہے
کہیں بھی شاخ گل دیکھے تو جھولا ڈال دیتی ہے

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ختم میلہ ہو گیا
اڑ گئیں آنگن سے چڑیا گھر اکیلا ہو گیا

کسی بچے کی طرح پھوٹ کے روئی تھی بہت
اجنبی ہاتھ میں وہ اپنی کلائی دیتے

کسی کے زخم پر چاہت سے پٹی کون باندھے گا
اگر بہنیں نہیں ہوں گی تو راکھی کون باندھے گا

منور رانا کی شاعری میں بے لوث اور پاکیزہ رشتوں کے ساتھ گاؤں کی مٹی میں رچے بسے سچے جذبات کی مہک بھی ہے۔ جہاں شہر کی بہت سی جدید سہولیات ہماری روزمرہ زندگی کا آسان اور uptodate بناتی ہیں وہیں گاؤں فطری طرزِ زندگی کی سہولیات فراہم کرتا اور ہمیں فطرت سے قریب تر کرتا ہے۔ گاؤں کی زندگی کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ گاؤں والے شہر کے لوگوں سے زیادہ مہربان، دوستانہ مزاج اور پُر جوش ہوتے ہیں۔ شہروں میں رہنے والے لوگ دیہاتیوں کے مقابلے میں نسبتاً مصروف اور تنہا پسند ہوتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کو جس خوبصورتی کے ساتھ منور رانا نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ دیگر شعراء کے یہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے کی ملتی ہیں۔ جیسے ؎

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں مین چھپربھی سب مل کر اٹھاتے ہیں
ہمار ا گاؤں سے رشتہ ابھی نہیں ٹوٹا
ابھی بزرگوں کی خوشبووطن سے آتی ہے
ان گھروں میں جہاں مٹی کے گھڑے رہتے ہیں
قد میں چھوٹے ہوں مگر لوگ بڑے رہتے ہیں
سونے پنگھٹ کا کوئی درد بھرا گیت تھے ہم
شہر کے شور میں کیا تم کو سنائی دیتے
تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

حب الوطنی کا جذبہ ایک مضبوط طاقت کے طور پر کام کرتا ہے۔ یہ عوام کو آپس میں ایک قوم کی شکل میں متحد کرتا ہے جو بڑی سے بڑی طاقتوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔اردو زبان وادب نے ہمیشہ ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کے نغمے گائیں ہیں۔اردوادب کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو نثری اور شعری اصناف میں ادیبوں نے اپنے گاؤں اور ملک کی مٹی سے محبت کے جذبات کا بھرملا اظہار کیا ہے اوران میں منوررانا نے جس قدر اپنی شاعری کے ذریعے حب الوطنی کے جذبات کا اظہار کیا وہ قدرے مختلف ہے۔انہیں اپنے وطن کی مٹی بھی ماں کی طرح ہر دل عزیز رہی ہے۔ان کی شاعری میں اپنے وطن کی مٹی میں سماجانے کی خواہش کے ساتھ ساتھ مشترکہ تہذیب کی پاسداری بھی قدم قدم پر موجود ہے۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

مٹی میں ملا دے کہ جدا ہو نہیں سکتا
اب اس سے زیادہ میں ترا ہو نہیں سکتا

ہم ہیں گزرے وقت کی تہذیب کے روشن چراغ
فخر کر عرض وطن ہم آج تک دنیا میں ہیں

ضرورت روز ہجرت کے لیے آواز دیتی ہے
محبت چھوڑ کر ہندوستان جانے نہیں دیتی

پیدا یہیں ہوا ہوں یہیں پر مروں گا
انہیں فرقہ پرستی مت سکھادینا کہ یہ بچے

زمین سے چوم کر تتلی کے ٹوٹے پر اٹھاتے ہیں
چلو چلتے ہیں مل جل کر وطن پر جان دیتے ہیں

بہت آسان ہے کمرے میں وندے ماترم کہنا

تقسیم ہند اور ہجرت کے المیے کو کئی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیق میں قیام پاکستان کے وقت اور دورانِ ہجرت لاکھوں انسانوں پر جو قیامتیں گزریں، کا نقشہ کھینچا لیکن مہاجرین کے پُر درد جذبات و کیفیات اور انتہائی کرب ناک واقعات کو جتنی شدت کے ساتھ عام فہم الفاظ مگر پُر سوز انداز میں اپنی طویل نظم ''مہاجر نامہ'' میں بیان کیا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اگر چہ اس سے قبل بھی تقسیم ہند خصوصاً ہجرت کے حوالے سے بیشتر شعراء نے اس سانحہ کی دلدوز تصویر کشی کی ہیں مگر منور اراناکا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے ''مہاجر نامہ'' کے ذریعے ہجرت کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ جیسے

مہاجر ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں

تمہارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں
نئی دنیا بسالینے کی ایک کمزور چاہت میں
پُرانے گھر کی دہلیزوں کو سونا چھوڑ آئے ہیں
پکا کر روٹیاں رکھتی تھی ماں جس میں سلیقے سے

نکلتے وقت وہ روٹی کی ڈلیا چھوڑ آئے ہیں
غزل یہ نامکمل ہی رہے گی عمر بھر رانا
کہ ہم سرحد سے پیچھے اس کا مقطع چھوڑ آئے

منور رانا جہاں ایک طرف ماں، مٹی، بیٹی اور بہن کے نرم و نازک جذبات کی عکاسی کرتے ہیں وہیں دوسری جانب معاشرے میں سیاسی بدنظمیوں کے نتیجے میں پھیلی مفلسی، بے حسی اور خودغرضی کو نمایاں کرتے ہیں۔ان کے وسیع اور گہرے مشاہدے کے سبب ہی وہ اپنے گردوپیش کے تمام مسائل سے لیکر سماج وسیاست کی بڑی سے بڑی خامیوں اور خرابیوں پہ گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان تمام پریشانیوں اور مسائل کو نمایاں کر کے عدل وانصاف کی خاطر جرات مندانہ واحتجاجی شاعری کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔جس کا اندازہ ان مذکورہ اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے ؎

بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غریبی کان چھدواتی ہے تنکا ڈال دیتی ہے
امیر شہر کا رشتے میں کوئی کچھ نہیں لگتا
غریبی چاند کو بھی اپنا ماما مان لیتی ہے
سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

شاعری جذبات واحساسات کا بہترین وسیلہ اظہار ہے۔منور رانا شاعری کو داخلی وخارجی جذبات کے اظہار کا آلہ بناتے ہیں۔یہ جذبات کبھی نرم ونازک اور کبھی سبک ولطیف، کبھی تیز وتند اور کبھی ان کی شاعری کی جڑیں اس سماج کی مٹی میں پیوست ہیں جو ان کی نس نس میں سرایت کرتی ہیں۔زندگی سے ان کا رشتہ بہت گہرا اور پائیدار ہے۔انہوں نے زندگی کی سچائیوں کو قریب سے پرکھا اور اس کی حقیقتوں کو بہت ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ اپنے اندر جذب کیا ہے۔سماج میں ناسور بنتے ہوئے فرسودہ رسم ورواج، استبداد اور استحصال کے خلاف منور رانا کی شاعری ایک احتجاج ہے۔منور رانا فطرتاً ایک نرم دل شاعر ہیں۔سماجی نابرابری، انسانی مجبوری ومظلومی، تنہائی ومحرومی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔مشرف عالم ذوقی ان کے بارے میں رقمطراز

ہیں:

''منور رانا کے یہاں چند ایسی خصوصیتیں ہیں جس سے وہ اپنے ہمعصرں میں بالکل الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ان کے کلام میں جو تنوع ہے اور جو گھریلو فضا ہے، جو برجستگی ہے وہ ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتی ہے۔تنقید کا میزان ایسا بھی ہونا چاہیے کہ عصر حاضر کے شاعروں کے کلام کو پرکھنے سے پہلے اس کی شخصیت کا بھی ہلکا سا مطالعہ کرلیا جائے تو بات مزید کھلتی چلی جاتی ہے۔منور رانا ایک مخلص شخص ہیں۔ایک ذہین فنکار، موضوع سے انصاف کرنے والے شاعر محض جدید نہیں۔اس لیے ان کے کلام میں جو گھریلو فضا ہے، جو آس پاس کا ماحول ہے وہ بہت دیکھا بھالا اور بار بار دیکھا معلوم ہوتا ہے۔''[۴]

جدید غزل کے منظر نامے پر منور رانا ایک مضبوط و مستحکم غزل گو کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔انہوں نے اپنے عہد کے تقاضے کے مطابق موضوعات کا انتخاب کیا اور منتخب موضوعات کے پیش نظر اسلوب اختیار کیا جو ایک سنجیدہ شاعری کی اہم ذمہ داری بھی ہے۔ان کی غزل کے متعلق والی آسی لکھتے ہیں:

''منور رانا نے زندگی گزارنے کے لیے جس طرز، روّیے اور سبھاؤ کو اپنایا ہے تقریباً وہی لہجہ، وہی انداز اور وہی اسلوب انہوں نے بغیر کسی مصلحت کے اپنی غزل کے لیے بھی منتخب کیا ہے۔''[۵]

منور رانا جدید دور کے منفرد اور احتجاجی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ انشائیہ نگار بھی تھے۔جہاں ایک طرف ان کی شاعری عام فہم، سادہ اور پُر تاثر ہوتی ہے وہی ان کی نثر میں ایک خاص طرح کی شگفتگی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ان کے کئی نثری مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں بغیر نقشے کا مکان، سفید جنگلی کبوتر، چہرے یاد رہتے ہیں، ڈھلان سے اترتے ہوئے، پھنک تال، وغیرہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔یہ تمام مضامین تیکھی دھار، لطیف اور دل پذیر طنزیہ مضامین کی بہترین مثال ہیں۔طنز کے لیے جو سوجھ بوجھ، ذہانت وفطانت، مشاہدہ اور فکری بالیدگی کی غیر معمولی صلاحیت درکار ہوتی ہے، منور رانا کے اندر وہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔انہیں انسانوں کو سمجھنے اور پرکھنے کے بہت سے مواقع میسر آئے۔بچپن میں مختلف شہروں میں قیام

کرنے اور پھر ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں عملی طور پر شریک رہنے کی وجہ سے ان کے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوتا رہا ہے ۔وہ اپنے عہد کے مسائل سے پوری طرح واقف تھے اور ان مسائل کو وقتاً فوقتاً اپنی نثر کے ذریعہ سامنے لانے کے سعی کی ہے۔کبھی وہ مظلوم کی اور کبھی مزدور کی ،کبھی محروم کی اور کبھی مہجور کی صدا بن کر سامنے آتے ہیں،تو کبھی سیاسی بدنظمیوں ،سماجی نابرابری اور کبھی سرمایہ داروں کے خلاف احتجاجی آواز بن جاتے ہیں ۔ان کے یہاں ترقی پسندانہ رجحانات پائے جاتے ہیں ۔ان کی تخلیقات زیادہ تر انسانی زندگی کے انتشار،اضطراب،دکھ درد،محرومی، بے بسی،مفلسی،اور بحران جیسے موضوعات سے مملو نظر آتی ہیں ۔ان کی شاعری کی طرح ان کی نثر بھی منفرد اسلوب کی حامل ہے جس میں سماج کی سفاک حقیقتوں کے طنز میں ہلکا تیکھا پن ہے جو سینے میں پیوست ہوجاتا ہے۔علاوہ ازیں ان کی نثر میں زبان کی سادگی کے ساتھ ساتھ راوانی بھی ہے۔منور رانا اپنے ایک مضمون میں ملک کی تقسیم کے کریہہ المنظر واقعے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ملک کی تقسیم اور ہجرت کی تیز رفتار آندھی نے اردو زبان کے بیشتر سرمائے کو تتر بتر کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔یعنی غزل کے شعر کا ایک مصرعہ تقسیم کی نذر ہو گیا اور دوسرا مصرعہ حشو وزائد ہو کر رہ گیا لیکن اپنے تلوؤں کے کانٹے چنتے ہوئے مسافروں کی نظر جب غزل کے ہجرت نصیب مصرعوں پر پڑی تو گیسوئے غزل کے گرفتاروں نے ان مصروں کی قلم، جہاں زرخیز زمین دیکھی وہاں لگاتے چلے گئے اور پھر سائنس کی ترقی نے ساری دینا کو جب ایک ترقی یافتہ گاؤں کے برابر کر دیا تو اندازہ ہوا کہ ہجرت کی بھیڑ میں بھٹکتے مسافروں اور ان کو تلاش کرتی ہوئی آنکھوں نے اس ترقی یافتہ گاؤں کی ہر رہ گزر پر اردو غزل کی کہکشاں سجائے رکھی۔ایسی کہکشاں جو راتوں کو پُر نور کرتی ہے اور دن کے اجالے میں مشترکہ ہندوستان کے ان ادبی چراغوں کی نشاندہی کرتی ہے جن کے خونِ جگر کی مہک ابھی تک دامنِ غزل سے آتی ہے۔''[۶]
>
> سفید جنگلی کبوتر،منور رانا،مژگاں پبلی کیشن،کولکاتا،

ملک کی تقسیم اور ہجرت کا اندوہ اتنا گہرا اور الم ناک رہا کہ اس کا منظر ان کی اکثر تحاریر میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس حوالے سے یہ اقتباس پیش خدمت ہیں:

''ایک سیاسی لکیر نے سب کچھ تقسیم کر دیا۔ ملک کو، قوم کو، رشتوں کو، محافظوں کو ، مجرموں کو، ندیوں تالابوں کو، ایک گھونسلے کے کئی حصے ہو گئے، ایک گھر کے کئی ٹکڑے ہو گئے، کسٹوڈین کی چکی میں اجداد کی عمارتیں پس گئیں، خاندانوں کے میٹھوں سے زمینداری کی بالوسرک گئی، جاگیرداری کے چہرے سے وقار اور اعتماد کا رنگ وروغن اڑ گیا، خاندانی زیورات (جنہیں غیر مردوں نے دیکھا تک نہیں تھا) ساہوکاروں کی تجوریوں میں قید ہو گئے۔ پاکستان بن گیا، اقبال کی پیشن گئی، جناح کا خواب تعبیر کی جستجو میں بھٹکتا ہوا پنجاب کے اس پار پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ ہر گھر میں ایک پاکستان تعمیر ہونے لگا۔'' ۷

طنز ومزاح بھی ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ اردو ادب میں طنز ومزاح نگاری کا ایک سنگ میل ''اودھ پنچ'' کو گردانا جاتا ہے۔ اس کے بعد طنز ومزاح لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، پطرس بخاری سے لے کر رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا جیسے عظیم فنکار سامنے آئے جن کے قلم میں بلا کی روانی تھی۔ انہوں نے طنز وظرافت کے جو نمونے پیش کئے وہ اردو ادب کا لازوال کارنامہ ہے۔ چنانچہ دورِ حاضر میں انہی کی طرح طنز وظرافت کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی نثر لکھنے والوں میں منور رانا ایک اہم نام ہیں۔ ان کے یہاں جہاں سنجیدہ نثر پائی جاتی ہے وہی ظرافت کی کلکاریاں نرالے اور اچھوتے انداز میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انہوں نے انشائیے اور خاکے کے بہت ہی لطیف وشگفتہ پیرائے میں تحریر کئے ہیں۔ اس حوالے سے یہ اقتباس پیش خدمت ہیں:

مرزا غالب رمضان میں گناہ کرتے ہوئے پکڑے گئے تو یہ تاویل پیش کی تھی کہ رمضان میں شیطان جس جگہ قید کئے جاتے ہیں، ان کی یہ کوٹھری بنی ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت آبادی کم تھی اسی لیے شیطان بھی کم تھے۔ اب سو برسوں میں آدمی بھی بڑھتے ہیں اور شیطان بھی، بلکہ کسی کسی محلے میں انسانوں کی آبادی کم ہے۔ رمضان میں شہود عالم آفاقی سے حکیم صاحب کے مطب میں ملاقات ہو گئی میں نے شہود صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ رہا کر دیئے گئے۔ شہود نے حکیم صاحب کو معنی

خیز نظروں سے دیکھا اور بولے کی میں رہا نہیں ہوا ہوں بلکہ میری جیل تبدیل ہوئی ہے۔ رمضان میں شاعروں کو دن میں تلاش کرنا گونگے کے منہ میں زبان تلاش کرنے کے مترادف ہے لیکن مغرب کی اذان ہوتے ہی تمام شعراء پھولی ہوئی لاش کی طرح سطح زمین پر تیرنے لگتے ہیں۔ ہر ہوٹل کے غیر ضروری پردے کے پیچھے ایک آدھ شاعر ضرور ہوتا ہے بلکہ کسی کی ہوٹل میں تو پورا مشاعرہ موجود ہوتا ہے غیر ضروری اس لیے کہ ہوٹل کے ان پردوں سے کھانا تو کھانا ہے، ہوٹل والے اور کھانے والے کے اعمال تک جھانکتے ہیں۔''۸؎

منور رانا جدید دور کے منفرد تخلیق کار ہیں جنہوں نے اردو ادب کو نئی لفظیات اور نئے اسلوب سے روشناش کرایا۔ جہاں ایک طرف وہ شاعری میں اپنی منفرد شناخت قائم رکھتے ہیں وہی دوسری جانب نثر میں وہ ایک صاحب طرزِ انشا پرداز کے بطور اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ادیب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی اور اسٹیج پروگراموں کی نظامت بھی کی۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں کئی انعامات واعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ جیسے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، بھارتیہ پرشید پریاگ ایوارڈ الہ آباد، مولانا عبدالرزاق ملیح آباد ایوارڈ، بزم سخن ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، شہود عالم آفاقی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، کبیر ایوارڈ، امیر وخسر وایوارڈ، ایکتاا ایوررڈ، جنگ ایوارڈ (کراچی)، ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ (جسے انہوں نے حکومت کو واپس کردیا) انہیں اتر پردیش اردو اکیڈمی کا صدر بنایا گیا لیکن مشاعرے کی مصروفیات کے سبب کچھ ہی مہینوں میں اس عہدہ صدرات سے مستعفی ہوگئے اور اس وجہ سے وہ طنز وطعن کا کا نشانہ بن گئے۔ اس طرح ایک طرف ادب میں ان کی شخصیت جداگانہ رہی وہی دوسری اور کچھ متنازعہ پہلو بھی جڑ گئے۔ کچھ ادبی حلقوں کا ماننا تھا کہ منور رانا اپنی تشہیر کے لیے اس طرح کے عمل کو سرانجام دیتے ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ وقت کے تقاضے کے لحاظ سے جس عمل اور جس بات کی ضرورت ہوتی تھی ردِ عمل کی پرواہ کئے بغیر اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ منور رانا نے کئی ملکوں کے سفر کیے ان کی شہرت کا عالم یہ ہے کہ پوری دنیا میں جہاں اردو بولی، پڑھی، سمجھی جاتی ہے اور جن ممالک میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تقریباً ان سبھی ممالک مثلاً بحرین، قطر، پاکستان، سعودی عرب، دبئی، شارجہ اور لندن میں حصہ لیا ہے۔

منور رانا کی شخصیت اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے جس ہنرمندی سے روایتی موضوعات کو نئے اسلوب کے قالب

میں ڈھال کر پیش کیا وہ انہی کا خاصہ ہے۔آپ اردو شعروادب میں اپنے منفرد لب و لہجے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔اردو غزل جیسی ہر دلعزیز صنف سخن میں رنگا رنگ موضوعات کو پیش کرنے کے دوش بہ دوش اردو نثر میں انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جس میں ظرافت کی چاشنی بھی ہے اور سنجیدگی وفکری گیرائی و گہرائی بھی۔الغرض منور رانا عہد حاضر کے ایک ممتاز ومعروف شاعر ہی نہیں بلکہ عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔اردو مشاعروں کے اسٹیج پر بے پناہ شہرت بٹورنے والا، ماں، مٹی، اور محبت کے یہ شاعر ہم سے ۱۴ جنوری ۲۰۲۴ء کو طویل بیماری کے سبب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

جسم پر مٹی ملیں گے پاک ہو جائیں گے ہم
اے زمین ایک دن تیری خوراک ہو جائیں گے ہم

منور رانا کا جسم بھلے ہی اس زمین کی خاک میں مل گیا ہو مگر ان کی آواز اور ان کی غزلیں زندہ جاوید رہیں گی اور ہمیشہ ہمارے دلوں کو منور کرتی رہیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ ''ماں''۔منور رانا۔والی آسی اکیڈمی،لکھنؤ ۲۰۰۵ء۔ص ۱۳
۲۔ رسالہ ''چہارسو'' جلد ۲۵۔مارچ،اپریل ۲۰۱۶ء۔ص ۱۲
۳۔ ''تین شہروں کا چوتھا آدمی۔مرتبین،مومن وسنجر ہلال بھارتی۔مژگاں پبلی کیشن۔نومبر ۲۰۱۴ء۔ص ۳۴۲
۴۔ ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔شمارہ ۹۔ستمبر ۱۹۸۴ء۔ص ۱۲۴
۵۔ ''نیم کے پھول''،والی آسی۔۱۹۹۰ء۔ص فلیپ
۶۔ ''سفید جنگلی کبوتر''۔منور رانا۔مژگاں پبلی کیشن،کولکاتا ۲۰۰۵ء۔ص ۱۹۵
۷۔ ''بغیر نقشے کا مکاں''،منور رانا۔پہچان پبلی کیشن،الہ آباد ۲۰۰۱ء۔ص ۲۰۶
۸۔ ''بغیر نقشے کا مکاں''،منور رانا۔پہچان پبلی کیشن،الہ آباد ۲۰۰۱ء۔ص ۱۲۰

☆☆☆

رابطہ:
ڈاکٹر جاں نثار عالم،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اردو،لکھنؤ یونیورسٹی
فون:9792453618
ای میل:jannisaralamlko@gmail.com